عید

عید

از

محمد مرتضیٰ مرحوم

(طبع ثانی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عید

هنیاً لك العیدُ الذی انتَ عیدہٗ ÷ وعیدٌ لمن سمّیٰ وضحّیٰ وعیّدا (متنبی)

مجھے فرمایشی مضمون لکھنا بالکل نہیں آتا اور علمی دنیا میں مجھ پر اس قدر خود فراموشی کا عالم طاری ہے کہ بقول غالب ؎

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی ... کوئی اپنی خبر نہیں آتی

اسی عالم میں عید کے دن علی الخصوص ایک اور تازہ و پُر از جذبات کیفیت طاری ہوتی ہے جس کا ایک خاکہ کھینچنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اگرچہ اس میں بے حد شبہہ ہے کہ آیا الفاظ اس کے لئے پوری طرح کام دے سکیں گے یا نہیں؟ الغرض جب عید کا دن آتا ہے تو میرے دل میں ایک جذبات کا تلاطم برپا ہوجاتا ہے۔ الغرض معمولی لازمۂ زندگی سوبچ کے ساتھ ساتھ جب گھر سے باہر قدم نکلتا ہے تو سب سے پہلے یہ سماں نظر آتا ہے کہ بنی نوع انسان کی ایک جماعت اپنی اپنی حیثیت کے مطابق اچھے اچھے لباس زیب تن کئے ہوئے مسجدوں کی طرف رواں ہے۔ یہ سماں میں سمجھتا ہوں کہ بنی نوع

انسان کے مختلف الکیفیات طبائع میں، مختلف اثرات پیدا کرتا ہوگا ایسے تو بہت سے ہوں گے، جو کسی اچھی نئی وضع کے کپڑے کو دیکھ کر فوراً کہہ اٹھیں کہ واہ کیا اچھا کپڑا ہے۔ یہ تو عام سطحی نظر ہوگی، جس سے چنداں بحث نہیں بہت سے ایسے بھی ہوں گے جو غربت کی حالت میں ہوں گے، اور کسی کی شان امارت دیکھتے ہوئے اُن کے دل میں یہ خیالات پیدا ہوں گے کہ آہ کیا ہمیں یہ پرتکلف شان نصیب نہ ہوگی؟ ایسے خیالات کا ہر زمانہ میں ہر وقت پیدا ہوتے رہنا لازمہ شان تخلیق ہے اور حکمت نے اس کا یہی جواب دیا ہے لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ ۚ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ "کیسی عمیق تعلیم ہے جو اس بوقلموں مگر ساتھ ہی پر اسرار پرپیچ ہستی کے جلوہ آرا نے عطا کی ہے! لیکن میں پوچھتا ہوں کہ ان لکھو کھا افراد سے جو اس زباں کو اپنی آخرت کی زبان یقین کرتے ہیں، کتنے ہزار نہیں تو کتنے سو ایسے ہیں جو اس کو صحیح طور سے پڑھ بھی سکتے ہیں؟ اور پھر ان چند میں سے کتنے ایسے ہیں جو اس کے معنی کو سمجھ سکتے ہیں؟ اور پھر ان اقل قلیل میں سے کتنے ایسے ہیں جنہوں نے نظام تخلیق پر غور کی نظر ڈالنے کے بعد درحقیقت اس کا اذعان پیدا کیا ہو کہ انسان کو اس دار المحن زندگی میں کوئی چیز باعث آرام ہوسکتی ہے تو وہ یہی حکومت حقہ ہے کہ ہم دنیا کی اس تازگی پر اپنی آنکھ نہ اٹھائیں؟ آہ آہ مجھے بتاؤ کہ اس جماعت میں سے جو اس کی مدعا

ہے کہ ہم ہی ہدایتِ تازہ رکھتے ہیں اور جن کو اس ہدایتِ تازہ رکھنے کے صلہ میں خود ہی تازگیٔ دنیا ملتی ہے، کتنے ایسے ہیں جو سچے دل سے اس پر عامل ہیں؟ خیر یہ تو ابتدائی منظر تھا۔ راستہ بھر میں اور مختلف سماں نظر آتے ہیں۔ بہت سے ایسے بنی نوع ملیں گے، جن پر بظاہر اس عید کا اثر نہیں ہے۔ بہت سے ایسے بھی ملیں گے جو اپنی معمولی تکلیف اور مصیبت سے بھری زندگی بسر کر رہے ہیں لیکن خیر مجھے اس سے بھی زیادہ بحث کی ضرورت نہیں۔ ایسے عام کیفیاتِ زندگی پر بودھ نے بھی نظر ڈالی ہے اور آخر چلا اٹھا کہ نجات صرف فنا میں ہے

خویش را گم کن کمال اینست و بس　　رو در و گم شو وصال اینست و بس

لیکن اب میں اس وقت ان جھگڑوں میں نہ پڑوں گا۔ اس زمانہ کا فلسفہ ہی کچھ اور ہے اور ہماری حالت و لوازم زندگی بھی پانچ ہزار سال کی نسبت کچھ اور ہی ہیں۔ میں صرف ان جذبات سے بحث کروں گا جو عیدگاہ جانے والوں سے متعلق ہو سکتے ہیں۔ میں جب بیگم بازار کے راستہ سے گزرتا ہوں تو جو کچھ حالات پرانے سیاحوں وغیرہ نے لکھے ہیں وہ خاص طور پر تازہ ہو جاتے ہیں۔ سیاحانِ ارضِ مغرب کے بیانات علی الخصوص میڈوز ٹیلر کے تحریرات، جب کہ گویا ہماری قدیم مشرقی تہذیب کا آخری جلوہ تھا، بیگم بازار کی چھوٹی چھوٹی گلیاں خبر دیتی ہیں کہ ایک صدی بلکہ نصف صدی پیشتر بسنے والی خلقتِ حیدرآباد موجودہ خلقت کی بہ نسبت

کس قدر مختلف الخیال واقع ہوئی تھی! آج کل کے خیال کے لحاظ سے وہ تاریک خیال کے لوگ تھے۔ لیکن جب ان گلیوں سے آگے بڑھ کر پرانے پل، مسجد میاں مشک وغیرہ اور دور سے سینکڑوں گنبدوں کو دیکھتا ہوں تو اس سے زیادہ پرانا تاریخی زمانہ یاد آتا ہے اور یہ سماں آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے، کہ عروس البلاد کے اگلے بسنے والے کس درجہ کے لوگ تھے۔ ماہرانِ فنون ہندسہ و تعمیر کا کمالِ فن، خاص کر یہ چیز دل اڑائے لئے جاتی ہے کہ وہ خالص اسلامی مہندسین تھے، جنہوں نے ایسے عمدہ نقش چھوڑے جن میں نہ صرف اصول تعمیر بلکہ اصول حفظان صحت کا بھی پورا پورا لحاظ پایا جاتا ہے اور بیسویں صدی کے اعلیٰ سے اعلیٰ مہندس بھی ان کے کام پر عش عش کرتے ہیں۔ میں تھوڑی دیر اس فخر کے پردے میں گویا فراموشی اور خود فراموشی کے عالم میں چلا جاتا ہوں۔ کئی کثیف حجاب حائل ہوتے ہیں۔ پھر دفعتاً چونکتا ہوں اور پرانے پل پر سے گذرتے ہوئے شہر کو جھانک کر دیکھ لیتا ہوں۔ سامنے کا منظر ندی کی روانی، کھلی فضا، ان سب باتوں سے میری خود فراموشی دور اور میں اچھی صحت کی زندگی میں آتا اور بہت دیر تک نظارۂ قدرت سے دماغ میں تازہ سرور حاصل کر لیتا ہوں جو گویا آئندہ تفکر شروع کرنے کے لئے ستانے کا باعث ہو، عیدگاہ پہنچ گیا۔ میر عالم کا تالاب پھر ابھارتا ہے کہ ان

پرانے مہندسوں کے بعد ایسے وقت جب کہ مشرق کا ہندسہ و تعمیر گویا لبِ گور تھی، ارضِ مغرب کے ہندسہ و تعمیر کے ساتھ ملا کر رفاہِ عام کا کیسا نمونہ ہمارے سامنے ہے۔ مجھے یاد آجاتا ہے کہ سوا صدی سے ملک میں اس امر کی کوشش جاری ہے کہ مشرق کے قدیم تمدن کے ضروری سامان کو مغرب کے جدید آلات سے ملا کر سجایا جائے لیکن اس میں ہم کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں؟ یہ سوال ہے جو غور طلب ہے۔ ان خیالات میں عیدگاہ کے اندر پہنچ جاتا ہوں۔ عیدگاہ کا شامیانہ بتاتا ہے کہ اب بھی ہم میں کچھ کاری گری باقی ہے۔ وعظ و نصیحت بہت سے دلوں کو رلاتی ہوگی۔ لیکن میرا دماغ اس وقت اس قدر شدید ضغط میں ہے کہ گھر سے نکلنے کے بعد گویا یہی وقت سب سے اشد ہوتا ہے۔ لوگ عمدہ عمدہ لباس پہنے ہوئے چلے آرہے ہیں (جتنے آنے تھے وہ نہیں آئے) اور بتاتے ہیں کہ عروس البلاد کی یہی شان ہے جس نے تمام اسلامی دنیا اور ہندوستان میں حیدرآباد کا نام روشن رکھا ہے۔ تاریخ کے سینکڑوں صفحے میرے سامنے آجاتے ہیں، قاضی، مفتی، خطیب، کوتوال، صوبہ دار کی ہاتھی پر سواریاں، وہ سب پرانے جاہ و جلال کو آنکھوں کے سامنے لا کھڑا کرتی ہیں۔ خطبہ شروع ہوتا ہے۔ خطیب کو چند سال پہلے تک قدیم وضع کا خوشنما سفید کامدار جوڑا پہنایا جاتا تھا جو شاہ جہاں کے عہد کو آنکھوں

کے سامنے تازہ کرتا تھا اور موسیو لیبان کی کتاب کا وہ صفحہ میری آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے، جس میں اس نے شاہ جہاں کے عہد کے جلوس کو تازہ کیا ہے۔ لیکن اب وہ لباس بھی مفقود ہو گیا۔ بہرکیف خطیب نے جو اگرچہ عرب نہیں تاہم سورۂ الزمر کی آیتیں اس سوز و گداز سے پڑھیں کہ میں قطعی مُوتُوا قَبلَ اَن تَمُوتُوا کا مصداق ہو گیا۔ میں کسی اور ہی عالم میں تھا جو دنیا کے تمام عالموں سے دیگر تھا۔ مصرعہ:-

قدرِ این بادہ ندانی تا نہ چشی

لیکن ابھی قرارت آغاز ہوئی تھی کہ ایک بچے کی چیخ و پکار نے جو آخر نماز تک جاری رہی، دردمندانِ رموزِ قرآنی کو گویا عین عالمِ وصال میں منغّص کر دیا۔ نماز ختم ہو گئی۔ توپوں کی گرج نے بتایا کہ ہم آصفی اسلامی سلطنت کے سایہ میں ہیں۔ بہرحال واپسی میں ہر وقت شبلی کی یہ نغمہ سنجی میرے وردِ زبان رہتی ہے، جو اُنھوں نے حیدرآباد کے لئے نظم کی تھی۔ حقیقت میں یہ نظم ایک یادگارِ زمانہ ہے ؎

یادگارِ حشمِ دیلم و سلجوق ہستی — پایۂ دولت بغداد و بخارا باتست
داستان ہائے عزیزان ہمہ از بر داری — خبر از قافلۂ یثرب و بطحا باتست
گرچہ شیرازۂ امت ہمہ ابتر شدہ است — آن ورق ہائے پراگندہ بیکجا باتست
آن پراگندہ نژادِ عرب و نسلِ عجم — یعنی آن دفترِ اسلام ہمہ جا باتست
گرچہ آن تازہ چمن آفتِ تاراجِ خزان — بازہم بوئے خوشی زان گلِ رعنا باتست

خیر یہ سب خیالات تاریخی فنا ہوگئے۔ اب صرف ایک ہی خیال ہے۔ اتنے ہزاروں نماز گذار کن جذبات وخیالات میں مستغرق ہیں؟ کیا ان کا تمام دن کام میں ہی صرف ہوتا ہے؟ کیا کبھی ان کو سوچنے کا کوئی وقت نہیں ملتا؟ آخر یہ کیا کرتے رہتے ہیں؟ وہ اپنی موجودہ حالت اور دنیا کے نقشہ سے بے خبر ہیں؟ انھیں اپنی دولت کی خبر ہے یا نہیں؟

سوال کا جواب یہی ہے کہ ہم اپنی ذاتی خواہشوں میں سرگردان ہیں! کاش جو وقت بچتا ہے اُس میں کبھی کبھی یہ غور کرلیا کریں کہ ہمارا کیا فرض ہے؟!

راقم
بے تاب گرمار

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس ع۔پ

مطبوعہ

اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز حیدرآباد

(دکن)